بحضورِ اقبال

علامہ اقبال کی خدمت میں میری پہلی اور آخری حاضری

ڈاکٹر مہر عبدالحق

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

بحضورِ اقبال

علامہ اقبال

کی خدمت میں

میری پہلی اور آخری حاضری

ڈاکٹر عبدالحق

یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا کئی دنوں بلکہ ہفتوں سے ہوسٹل کے لڑکوں میں کالج کی ادبی محفلوں کے پروگراموں میں اور شہر کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے درمیان چکبست کا یہ شعر گرما گرم مباحثوں کا موضوع بنا ہوا تھا ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اٹھارہ انیس سال کی عمر میں زندگی اتنی پیاری، حسین اور دلکش دکھائی دیتی ہے کہ اس کی رعنائیوں کے خلاف کہی ہوئی کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔ یہاں تک کہ اس کو گھن کی طرح کھا جانے والے عوارض مثلاً افلاس، بیماری، بڑھاپا، تفکرات بلکہ موت تک کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اس عمر کی جذباتیت کو دیوانگی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جوانی میں انسان زمانے کی نامساعدت کے ہزاروں صدمے سہ لیتا ہے لیکن زندگی کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔

چکبست کے مذکورہ شعر میں زندگی کی توہین کا پہلو ہمارے دل و دماغ میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ بڑے بڑے دانشوروں، ادیبوں، مذہبی رہنماؤں اور نامور اساتذہ کرام کی زبان فصاحت نظام سے طرح طرح کی تشریحات اور توضیحات سننے میں آئیں لیکن کوئی ایک توجیہ بھی ہم چند طالب علموں کو مطمئن نہ کر سکی۔

ایک شام کو "دارالاقامہ" کے کمرہ نمبر ایک میں محض اتفاق سے چند دوست جمع ہو گئے اور باتوں باتوں میں پھر اسی شعر کا ذکر چھڑ گیا لیکن اس مرتبہ ہماری سوچ کسی ایسی عظیم ہستی کی تلاش میں تھی جو ہمارے قلبِ مضطر کو تسکین عطا کر سکے۔ علم و ادب اور زہد و تقویٰ کی بڑی بڑی قدآور شخصیات کے اساتذہ گرامی سامنے آئے لیکن جونہی کسی نے

علامہ اقبال کا نام لیا سب نے بیک آواز اس کی تائید کی کیونکہ جوانوں کو آہِ سحر سے لذت آشنا کرنے کی تمنا اسی مردِ خود آگاہ نے کی تھی۔ چنانچہ یہ تو طے ہو گیا کہ شعر کے معنیات کی تفہیم کے لیے شاعرِ مشرق سے رجوع کیا جائے گا تاہم اس کی عملی صورت کیا ہوگی، آیا خط و کتابت سے کام لیا جائے گا یا کالج کی معرفت استفسارات بھیجے جائیں گے یا ہم طلبہ کا کوئی وفد لاہور جا کر ترجمانِ حقیقت کے درِ نیض پر دستک دے گا، اس پر متفق الرائے ہونے کے لیے کئی نشستیں ہوئیں۔

اس دوران بہت سے احباب ہمیں چھوڑ بھی گئے کیونکہ عام رجحان یہ تھا کہ انفرادی طور پر والدین کو لاہور کا خرچ برداشت کرنے پر راضی کیا جائے اور گرمی کی چھٹیوں میں کسی طے شدہ تاریخ پر ہم اکٹھے آستانۂ فقر و غنا پر حاضری دیں۔

اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے استقامت صرف چار دوستوں کے حصے میں آئی:

۱۔ عبدالصمد واجد : بہاولپور
۲۔ غلام مرتضیٰ احمد : سرگودھا
۳۔ شیخ غلام محمد : لیہ اور
۴۔ راقم الحروف : لیہ

میں ان دوستوں کے نام یہاں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آج چھپن سال کے بعد ہماری طالب علمانہ زندگی کا یہ نادر واقعہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ میرے تینوں ساتھی جو وکالت کے پیشے سے منسلک رہے ہیں، وفات پا چکے ہیں۔ میں بھی، جو کئی سالوں سے سوچ رہا ہوں کہ یہ واقعہ بیان کروں یا نہ کروں، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ ویسے چند سال پہلے قدرت اللہ شہاب مرحوم کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک ادبی اجلاس میں یہ واقعہ بیان کر چکا ہوں۔ آج اسے ضبطِ تحریر میں لا کر محفوظ کر لینے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی ہے کہ حال ہی میں میرے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین دوست کی کتاب چھپی ہے جس میں انہوں نے تاریخ کے جدلیاتی وجوب پر بڑی شدومد سے بحث کرتے ہوئے چکبست کا یہی شعر لکھا ہے اور اس کی وہی مادی تشریح پیش کی ہے جو میں چھپن سال پہلے مختلف ادبی حلقوں میں سن چکا تھا۔ علامہ اقبال نے جو مفاہیم ہم طلبہ کو بتلائے تھے وہ اب میرے لیے قومی امانت کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان سطور کے ذریعے میں یہ امانت قوم کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ میرے اس بیان سے اُس زمانے کے طلبہ، والدین، دوست احباب اور عام معاشرے کے باہمی روابط کے کچھ خدوخال بھی سامنے آئیں گے جن سے نئی سوچ کو شاید کوئی رہنمائی مل سکے۔

بات، میں اس زمانے کی کر رہا ہوں جب کوئی مڈل پاس کر لیتا تھا تو سینکڑوں لوگ اسے دیکھنے کے لیے اُمڈ

پڑتے تھے۔ کالج کی تعلیم پر زیادہ سے زیادہ خرچ دس بارہ روپے ماہانہ ہوتا تھا اور ان دس بارہ روپوں کے لیے بھی والدین کو بڑی کٹھن مشکلات میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میری اس سرگزشت سے فکرِ اقبال کے ناقدین کے سامنے کوئی نیا نکتہ آ جائے یا اس سے اقبال کے سوانح نگاروں کو کوئی مدد مل جائے۔

لاہور میں ہم چاروں دوستوں کا کوئی واقف نہیں تھا، نہ ہی ہم میں سے کسی نے پہلے لاہور دیکھا تھا۔ ہم کالج کی معرفت بھی جانا نہیں چاہتے تھے۔ شوق یہ دامن گیر تھا کہ کسی طرح اس عظیم شخصیت سے براہِ راست اور بالمشافہ گفتگو ہو جائے اور اس دوران کوئی اور "بزرگ" حائل نہ ہو ورنہ گفتگو بحث کا رنگ اختیار کر لے گی اور ہم وہ کر رہ جائیں گے۔

میرے باقی تینوں دوستوں نے مجھے اطلاع دی کہ انہوں نے والدین سے اجازت حاصل کر لی ہے اور خرچ کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ میں دوستوں کے یہ خط لے کر والدِ محترم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پوری تفصیل کے ساتھ معروضات پیش کیں۔ اجازت کے ساتھ خرچ کے لیے بھی التماس کی۔

والد صاحب طبعاً بہت سخت تھے لیکن انہوں نے بڑے تحمل کے ساتھ میری بات سنی۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا:

"تمہارا منصوبہ تو اچھا ہے تاہم تم لوگ کس طرح اس منصوبے کو کامیابی تک پہنچاؤ گے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک دو دن انتظار کرو تمہارے بہنوئی چھٹی پر آنے والے ہیں، میں ان سے مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔"

میرے بہنوئی مہر نور محمد، والدِ محترم کے بھانجے تھے اور گریجوایٹ تھے۔ بہ فضلِ خدا زندہ ہیں اور بانوے تراوے کے پیٹے میں ہیں۔ ان دنوں مظفر گڑھ میں ڈپٹی کمشنر کے مشیر خواں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہماری پُرزور تائید کی اور یہ کہہ کر سارا مسئلہ حل کر دیا کہ مظفر گڑھ کے نواحی گاؤں "موندکا" کے رہنے والے ایک بزرگ، مولوی کریم بخش شاکر گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر ہیں، وہ ان طلبہ کے قیام و طعام کا بندوبست بھی کریں گے اور شاعرِ مشرق تک ان کی رسائی بھی کرا دیں گے۔ میں انہیں تفصیلی خط لکھ دوں گا۔

والدِ محترم کی تسلی ہو گئی۔ انہوں نے بہ طیبِ خاطر متوقع اخراجات کا انتظام بھی کر دیا اور ہماری علمی جستجو پر خوش ہوئے۔ تاہم فرمایا:

"ایک بار پھر وہ شعر سناؤ جو بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔"

میں نے شعر پڑھا، انہوں نے کوئی تاثر ظاہر نہ کیا لیکن شعر کو یاد کر لیا۔ چھ ماہ تک پڑھے ہوئے تھے۔ بہت زیرک، معاملہ فہم، سنجیدہ مزاج، سادہ طبیعت کے صاف باطن بزرگ تھے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کس حد تک

اقبال کے کلام و پیام سے متاثر تھے تاہم اتنا جانتا ہوں کہ میری والدہ محترمہ جنہیں والدِ محترم نے پرائمری تک گھر ہی میں خود تعلیم دی تھی، مجھے اوائل طفلی میں اقبال کی نظم "پرندے کی فریاد" نہایت پُرسوز سریلی آواز میں سنایا کرتی تھیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لاہور سے سینکڑوں میل دور پس افتادہ علاقوں میں بھی علامہ کا کلام کتنا مقبول تھا۔

قصہ کوتاہ، ہم چاروں دوست پروفیسر کریم بخش شاکر صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ پروفیسر صاحب نہایت بارُعب، کم گو اور کم آمیز بزرگ تھے۔ طویل قامت لیکن دبلے پتلے۔ فرش پر قالین بچھا کر بیٹھے تھے۔ سامنے ڈیسک پر نوشت و خواند کا سامان بڑے سلیقے سے چُنا ہوا تھا لیکن کمرے میں بے شمار کتابیں اِدھر اُدھر بکھری رہتیں۔ پُرانی انار کلی کے دھوبی محلہ میں ایک بالائی منزل کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس میں اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک علیحدہ کمرہ مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ ہمیں اسی کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ عام ضرورت کی تمام چیزیں مہیا تھیں۔

پروفیسر صاحب ہمہ وقت مطالعہ اور غالباً تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے تھے۔ ملاقاتی بہت کم آتے تھے ملازم بھی کوئی نہیں تھا۔ محمد بخش نام کے ایک شخص جو کہیں لاہور ہی میں جُز وقتی ملازم تھے ان کے ہاں اقامت گزیں تھے۔ اندر باہر کے سارے کام انہی کے سپرد تھے۔

ہم لوگ منہ ہاتھ دھو کر کچھ دیر آرام کر چکے تو یہی صاحب ہمارے کمرے میں آئے اور کہا کہ پروفیسر صاحب نے یاد فرمایا ہے۔

ہم ان کے ساتھ پروفیسر صاحب کے دارالمطالعہ میں پہنچے اور اشارہ ملنے پر ان کے سامنے نیم دائرہ سا بنا کر نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ پروفیسر صاحب نے ہر ایک کے کوائف پوچھے۔ پھر فرمایا:

"تمہارے لاہور میں آنے کا مقصد مجھے میر نور محمد صاحب نے خط کے ذریعے بتا دیا ہے اور میں نے اس عظیم ہستی سے بات بھی کر لی ہے جس سے تم ملنا چاہتے ہو۔ کل سہ پہر کے پانچ بجے تم انہیں اپنا منتظر پاؤ گے۔ محمد بخش تمہیں ان کی کوٹھی پر چھوڑ کر آئے گا اور پھر واپس بھی لے آئے گا۔ لاہور کی سیر کرنا چاہو تو بھی محمد بخش تمہارے ساتھ رہے گا۔ کھانا ہمیں گھر پر ہی کھاؤ گے۔ علامہ کے ہاں جا کر کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی جو ان کے اور خود تمہارے وقار کے منافی ہو یا ہماری علاقائی روایات کے خلاف ہو۔"

جولائی کا پہلا عشرہ تھا۔ تاریخ یاد نہیں رہی۔ دن پیر کا تھا۔ برسات کا آغاز ہو چکا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ دوپہر کی بوندا باندی سے ہوا میں خوشگوار خنکی آ گئی تھی۔ ہم نے کلف لگے سفید اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ شلوار قمیص، کمری کوٹ، کالے بُوٹ اور سر پر ترکی ٹوپی جو بہاولپور کی پہچان تھی۔

لاہور کی نمک بوس عمارتیں بارش سے دھل کر نکھری ہوئی تھیں لیکن تانگے میں بیٹھے ہوئے ہم میں سے کسی کی نگاہ ان پر نہیں پڑ رہی تھی۔ سب تصورات میں گم تھے۔ کہاں وہ عقل و دانش کا مہرِ منیر و زاور کہاں ہم علم و ادب کی موم بتیاں جو اپنی ہی لو سے پگھلنے لگ جاتی ہیں۔ ہمارے ذہن میں علامہ کے مختلف انداز کی کئی تصویریں محفوظ تھیں۔ خدا معلوم آج ہم انہیں کس رنگ میں دیکھیں گے، دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں کیونکہ ہم سب پہ ایک ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ دل میں ہزاروں خیالات کا ہجوم تھا لیکن زبانیں خاموش تھیں۔ تاہم ایک انجانی سی مسرت بار بار ہمارے شعور اور اشتیاق کو جرأت کا احساس دلا رہی تھی۔

تانگہ ایک کوٹھی کے سامنے رک گیا۔ پھاٹک آدھا کھلا تھا۔ محمد بخش نے کہا:

"اندر چلے جائیں۔ میں آدھے گھنٹے تک آجاؤں گا۔"

پھر ذرا مسکرایا اور چل دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو ؎

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی!

ہم پھاٹک کے اندر چلے گئے۔ ایک ملازم (غالباً علی بخش) ہمیں ایک کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ ابھی ہم ماحول کی سادگی اور بے تکلفی کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ایک وزن دار آواز نے ہمیں چونکا دیا:

"السلام علیکم نوجوانو!"

ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ عالمِ اسلام کا بہت بڑا مفکر، فلسفۂ خودی کا خالق و مفسر اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کو نئے انداز سے پیش کرنے والا عظیم مدبر نہایت شگفتہ انداز میں ہم سے مخاطب تھا۔

غلام مرتضیٰ محمود کو ہم نے اپنا لیڈر منتخب کیا تھا۔ اس نے اپنا اور باری باری ہم سب کا تعارف کرایا۔ تعارف کے دوران شانِ سکندری والے مردِ قلندر ہر ایک سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے اور مشفق دوست کی طرح ذاتی سوالات پوچھتے رہے۔ ایک چٹکلا بھی چھوڑا کہ لیہ اور لاہور میں معنوی اشتراک ہے۔ دونوں شہر کہتے ہیں جو کچھ تمہارے پاس ہے لے کر آجاؤ۔

اس پر ہلکا سا قہقہہ پڑا تو میں نے حوصلہ پکڑتے ہوئے کہہ دیا:

"جنابِ والا! لیہ کو تو اہلِ لاہور کا قبلہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ لاہور کے عین مغرب میں واقع ہے"۔

میرے اس جملے پہ بہت خوش ہوئے تاہم فرمایا:

"ہر مغرب کو قبلہ نہ بنا لینا بیٹا! جس شعر کی تشریح کے لیے تم لوگ اتنی دور سے میرے پاس آئے ہو، وہ بھی مغربی فکر کا نتیجہ ہے۔ ہاں تو کیا ہے وہ شعر، ذرا تم ہی دہرا دو"۔

اس اثنا میں اقبال پلنگ پہ گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ چکے تھے۔ ہم نے کرسیاں ذرا قریب کر لیں۔ ہیبت اور

احترام کے ملے جلے ابتدائی تاثرات میں پہلی سی شدّت نہیں رہی تھی اور ہمارے تصوّرات پر جو خوف سا چھایا ہوا تھا وہ اس تیقّن سے بدل چکا تھا کہ ہم یہاں سے اطمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال ہو کر جائیں گے۔

میں نے قدرے دھیمے لہجے میں چکبست کا مذکورہ شعر پڑھ دیا اور ساتھ ہی گزارش کی کہ:

"اس کے معنے تو صاف ہیں لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے ہمارا دل اسے نہیں مانتا۔ ہم جناب والا سے یہ وضاحت چاہتے ہیں کہ کیا زندگی اور موت واقعی اتفاقی حادثات ہیں یا ان کے پیچھے کوئی مقصد کارفرما ہے۔ اگر مقصد ہے تو پھر یہ اتفاقیہ نہیں ہو سکتے۔ نیز اس مقصد کو تکمیل کی طرف آگے بڑھانے کے لیے کوئی بہت بڑا سرچشمۂ عقل و بصیرت بھی ہو گا۔"

میرا جملہ ختم ہوتے ہی میرے ساتھی عبدالصمد واحد بولے:

"جنابِ عالی! ہمیں محسوس ہوا ہے کہ اس شعر میں زندگی کو محض عناصر کی ترتیب کا نتیجہ کہہ کر زندگی کی توہین کی گئی ہے۔"

تیسرے ساتھی شیخ غلام محمد نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا:

"حالانکہ ہمارے نزدیک "زندگی" سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے حسین عطیّہ ہے۔"

علامہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ انہوں نے بڑے مشفقانہ انداز سے ہمارے چوتھے ساتھی غلام مرتضیٰ محمود کی طرف دیکھا۔ وہ بولے:

"جنابِ والا۔ آپ کا ارشاد ہے۔ ع

رہی زندگی موت کی گھات میں

لیکن ہمارا مشاہدہ اس کے برعکس ہے اور چکبست کے اس شعر سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ موت فاتح اور زندگی مفتوح ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ فکر اور مشاہدے کے اس تضاد کو بھی واضح کیا جائے۔"

شاعرِ مشرق لمحے بھر کے لیے خاموش ہو گئے جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ پھر ایک تیز، پارا ترقی ہوئی نظر ہم سب کے پُرسکون چہروں پر ڈالی اور استفسار کیا:

"آپ میں سے کوئی سائنس کا سٹوڈنٹ بھی ہے؟"

غلام مرتضیٰ محمود نے جواب دیا:

"نہیں جناب اس وقت تو نہیں البتہ میٹرک میں ہم سب نے سائنس پڑھی تھی۔"

فرمایا: "خیر کوئی بات نہیں۔"

پھر قدرے توقف کے بعد اپنا ہی ایک شعر بلند آواز میں، ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ؎

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدّر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

اور ہمارے ذہنوں میں وہ تمام افکار سمٹ کر ابھر آئے جن کا اظہار آپ 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کے عنوان کے تحت بانگِ درا میں کر چکے تھے۔ پھر فرمایا:

"زندگی ایک حسین عطیہ ہی نہیں، میرے نوجوان دوستو! بلکہ ایک گراں بہا نعمت بھی ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے یہ وہ گوہر یک دانہ ہے جو قطع و برید اور شکست و ریخت کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا۔ شکست و ریخت مادّی اشیاء میں ہوتی ہے کیونکہ یہ مادّی عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ انسانی جسم بلاشبہ عناصر ہی کی ترکیب و ترتیب سے ظہور پذیر ہوا ہے جو ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ جسم کے ختم ہو جانے سے آدمی ختم نہیں ہو جاتا جو اس کا مالک و مختار ہے۔ سائنس کی تحقیق کے مطابق ہمارا جسم لاکھوں کروڑوں خلیوں سے مرکب ہے جو ہر لمحے ٹوٹتے اور پھر بنتے رہتے ہیں۔ یعنی جو خلیہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جاتا ہے اس کی جگہ بالکل ویسا ہی ایک اور نیا خلیہ وجود میں آجاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سات سے دس سال کے عرصے کے دوران انسانی جسم کے سابقہ تمام خلیے ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے وجود میں آجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو، میرے عزیزو! کہ نیا جسم بال برابر بھی وہ نہیں ہوتا جو آٹھ دس سال پہلے تھا۔ پس اگر ہم عناصر کے ظہورِ ترتیب کو زندگی یا زندگی کو مشہود کرنے والا شخص قرار دے دیں تو تخریب و تعمیر کے اس عمل کے تحت وہ شخص ہی کالعدم ہو چکا ہوگا جس نے آپ کے ساتھ کوئی معاملاتی یا کاروباری معاہدے کر رکھے تھے۔ پھر تو دنیا کی کوئی عدالت کسی کو ان معاہدوں کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس مفروضے کی رُو سے وہ شخص اور تھا جس سے آپ نے معاہدہ کیا تھا اور یہ شخص اور ہے جس سے آپ معاہدے کی پابندی کرانا چاہتے ہیں۔ قول، قرار، معاہدے، سچ، جھوٹ، دیانتداری، مکر و فریب وغیرہ کی مثبت اور منفی صفات کا تعلق عناصر کے مجموعے یعنی جسم سے نہیں ہے اس شخص سے ہے جو جسم کی ہر تبدیلی کے باوجود قائم اور برقرار رہتا ہے۔"

عبدالصمد واجد نے عرض کی:

"جناب والا۔ جدید تصوّرات کسی مستقل یا قائم الدّائم وجود کے قائل نہیں ہیں بلکہ جنابِ والا کا بھی ارشاد ہے کہ ؎

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

ہمارے دیکھنے میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں آئی جو تغیّر نا آشنا ہو۔"

شاعرِ مشرق کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ پہلے سے بھی زیادہ قوی لہجے میں فرمایا:

"عزیزِ من! ہم مادّی دنیا میں رہتے ہیں۔ مادّی دنیا کی چیزیں حواسِ خمسہ کے ذریعے ادراک میں آسکتی ہیں لیکن بعض حقیقتیں ایسی بھی ہیں جن کا ادراک بصارت کی بجائے بصیرت سے ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے "زندہ" چیزیں تو دیکھی ہیں لیکن کیا آپ نے یا چکبست نے کہیں "زندگی" کو بھی دیکھا ہے؟ آپ نے انسانوں کو تو ہر جگہ دیکھا ہے کہیں "ہیومینٹی" بھی آپ کو دکھائی دی ہے۔ حالانکہ انسان آتے جاتے رہتے ہیں اور آتے جاتے رہیں گے لیکن "ہیومینٹی" جو ایک تجریدی تصور ہے، پائیدار ہے۔ اسی طرح زندہ چیزیں تغیر میں رہیں گی لیکن "زندگی" جو ایک تجریدی حقیقت ہے، دوامی ہے اور سیلِ رواں کی طرح آگے ہی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ بصارت کی بجائے بصیرت کے ذریعے ادراک میں آنے والی حقیقتوں کو سمجھنے کے لیے علمِ ریاضی کی مبادیات پر غور کرو۔ مادّی اشیا تمام کی تمام لمبائی، چوڑائی اور اونچائی یا گہرائی کی محتاج ہیں لیکن ان تینوں ابعاد کا تصور "نقطے" پر قائم ہے جس کی اپنی نہ لمبائی ہے نہ چوڑائی ہے اور نہ اونچائی وغیرہ۔ یعنی جو بصارت کے نزدیک عدم ہے لیکن بصیرت جسے عین حقیقت اور لازمی وجود سمجھتی ہے۔

عزیزو! یہ وہ حقیقتیں ہیں جو حواس کی رسائی اور گرفت سے باہر ہیں۔ ان کا ادراک صرف ایمانِ کامل ہی کر سکتا ہے جو بصیرت کی آخری ارتقائی صورت ہے۔ یاد رکھو، مقرون کو پیچھے چھوڑ کر تجرید کی طرف آگے بڑھتے رہنا علم کی معراج ہے۔"

میں آج چھپن سال کے بعد اس ملاقات کی رپورٹنگ کر رہا ہوں لیکن مجھے حافظے پر ذرا بھی زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی بلکہ ان تاریخی لمحات کا سارا نقشہ اس وقت بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے — ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان صداقت اور خلوص پر مبنی ہونے کے باعث اتنا پُرتاثیر تھا کہ ان کی ارشاد کردہ ہر بات دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔ ممدوح سے عقیدت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بعینہٖ کسی کو بھی یاد نہیں رہتے۔ انسانی فطرت معانی و مفاہیم کو یاد رکھتی ہے الفاظ کو بھلا دیتی ہے۔ میں یہ باتیں بھی اپنے الفاظ میں لکھ رہا ہوں تاہم ان کے مفاہیم سے سرِمُو بھی نہیں ہٹ رہا۔

علامہ کی تقریر تجرید کی اہمیت پر ختم ہوئی تو شیخ غلام محمد بولے:

"جنابِ والا! ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے اپنے نہایت قیمتی وقت میں سے چند لمحات ہم طلبہ کے لیے وقف فرمائے اور اپنے نورِ بصیرت سے ہمارے ذہنوں کو منوّر کر دیا۔ تاہم انسانی زندگی کے مقصد کے بارے میں بھی کچھ ارشاد ہو جائے تو عنایت ہوگی۔"

اسی لمحے ملازم دوسری بار ٹھنڈے مشروبات کے گلاس لیے کمرے میں داخل ہوا۔ علامہ نے ارشاد فرمایا:

"بیٹو، ایک مقصد تو یہی ہے کہ پیو اور پلاؤ"۔

اس پر پھر ایک بار ہلکا سا قہقہہ پڑا۔ اور ہم ادب آداب کو بالائے طاق رکھ کر حریصوں کی طرح مشروبات کی طرف لپکے۔

چند لمحات کے بعد پھر خاموشی چھا گئی تو فرمایا:

"زندگی ــــ ارتقا کی مختلف منازل طے کر کے جب موجودہ سطح پر پہنچی تو اسے "انسانی ذات" کا راہرد عطا کر دیا گیا لیکن یہ راہرد ناپختہ ہے۔ اس کے سفر کو آسان بنانے کے لیے اسے کچھ صلاحیتیں بھی دی گئیں۔ مثلاً علم، تفہیم، احساس اور ارادہ وغیرہ۔ انسانی ذات کے اندر دونوں امکانات ہیں۔ اپنی "ذات" یعنی خودی کو مستحکم کرنے کے بھی اور اسے توڑ پھوڑ دینے کے بھی۔ اس نے اپنے آپ کو مستحکم بنا لیا تو یہ "زندگی" کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کے قابل ہو سکے گی۔ اگر انتشار کا شکار ہو گئی تو آئندہ کی اعلیٰ منازل طے نہ کر سکے گی۔ اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ کون سے عوامل اسے مضبوط اور توانا بناتے ہیں اور کن عوامل سے یہ ضعیف اور ناتواں ہو جاتی ہے۔ پس انسانی زندگی کا مقصد "خودی" کو استحکام دینے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ انسانی جسم ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے، انہیں آزمانے اور انہیں ترقی دینے کا ذریعہ ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کسی کھلاڑی کو اپنی مضمر صلاحیتیں ابھارنے کے لیے کھیل کے میدان اور ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وقت ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ باتیں بھی بڑی دقیق ہوئی تھیں لیکن ہم میں سے کسی کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں تھے۔ رخصت ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس نابغۂ روزگار ہستی سے چند لمحات کا براہِ راست استفادہ ہی ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ ہم نے اطمینانِ قلب کی دولت حاصل کر لی تھی۔ ہم کتنے خوش قسمت تھے کہ اتنی قدآور شخصیت کے تبحرِ علمی سے فیضیاب ہو سکے۔

ہم نے شکریہ ادا کر کے رخصت لی۔ در و دیوار سے صدائے خاموش آ رہی تھی ؎

دگر دانائے راز آید کہ ناید

maas Journal of ISLAMIC SCIENCE

A UNIQUE — BI-ANNUAL — PUBLICATION

SPECIAL DISCOUNT FOR FOREIGN SUBSCRIBERS

40% OFF THE REGULAR RATE TO:

- Private & Religious Institutions and Organisations.
- Educational Centres and Libraries.

— 25% OFF THE REGULAR RATE TO:

- Students

PUBLISHING SINCE: 1985 1405H

FREQUENCY : Biannual

PAGES: 128

SIZE: 17.5cm x 26 cm

PLACE ORDERS TO YOUR LOCAL DISTRIBUTORS OR WRITE DIRECTLY TO:

**CIRCULATION DEPARTMENT,
THE MUSLIM ASSOCIATION FOR THE ADVANCEMENT OF SCIENCE,
FARIDI HOUSE, SIR SYED NAGAR,
ALIGARH-202 001 (INDIA)**

SUBSCRIPTION RATES

Group of Countries	Individuals 1-Yr.	2-Yrs.	3-Yrs.	Institutions 1-Yr	2 Yrs.	3-Yrs.
HIG	US$ 12 (20)	US$ 22 (38)	US$ 30 (54)	US$ 50 (60)	US$ 90 (110)	US$ 130 (160)
MIG	10 (18)	18 (34)	24 (48)	40 (50)	70 (90)	100 (130)
LIG	08 (16)	14 (30)	18 (42)	30 (40)	50 (70)	70 (100)
INDIA	Rs. 60/-	Rs. 110/-	Rs. 160/-	Rs. 100/-	Rs. 190/-	Rs. 280

Rates subject to change

Figures within Parantheses indicate AIR MAIL charges and without parantheses SURFACE MAIL charges.

High Income Group (HIG): U.S.A., Canada, West European countries, Japan, Saudi Arabia, Kuwait, U.A.E., South Africa, Libya, etc.

Middle Income Group (MIG): East European Nations, Nigeria, Iraq, Jordon, Egypt, Syria, Malaysia, Indonesia, Turkey, Iran, etc.

Low Income Group (LIG): Bangladesh, Sri Lanka, Pakistan, Sudan, etc.

**BACK ISSUES AVAILABLE ON PAYMENT.
RATES MAY BE QUOTED ON INQUIRY.**

All rights reserved